جاناں جاناں

احمد فراز



یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں
میں سب تری نذر کر رہا ہوں
یہ اُن زمانوں کی ساعتیں ہیں

تجھے کسی وقت یاد آئیں
تو ایک اِک حرف جی اُٹھے گا
پہن کے انفاس کی قبائیں
اُداس تنہائیوں کے لمحوں
میں ناچ اُٹھیں گی یہ اپسرائیں

مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دُکھ تھے یہ مانتا ہُوں
ہزار غم تھے جو زندگی کی
تلاش میں تھے یہ جانتا ہُوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانتا ہُوں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مگر ہر اک بار تجھ کو چھو کر

یہ ریت رنگِ حنا بنی ہے

یہ زخم گلزار بن گئے ہیں

یہ آہِ سوزاں گھٹا بنی ہے

یہ درد موجِ صبا ہوا ہے

یہ آگ دل کی صدا بنی ہے

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی

یہ پھول یہ زخم سب ترے ہیں

یہ دکھ کے نوحے یہ سکھ کے نغمے

جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں

جو تیری قربت تری جدائی

میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

وہ تیرا شاعر ترا مغنی

وہ جس کی باتیں عجب سی تھیں

وہ جس کے انداز خسروانہ تھے

اور ادائیں غریب سی تھیں

وہ جس کے جینے کی خواہشیں بھی

خود اس کے اپنے نصیب سی تھیں

نہ پوچھ اس کا کہ وہ دیوانہ

بہت دنوں کا اُجڑ چکا ہے

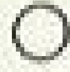
وہ کوہکن تو نہیں تھا لیکن

کڑی چٹانوں سے لڑ چکا ہے

وہ تھک چکا تھا اور اس کا تیشہ

اُسی کے سینے میں گڑ چکا ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com



اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

زندگی تیری عطا تھی سو ترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

اوّل اوّل کی محبت کے نشے یاد تو کر
بے پیے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں

آخر آخر تو یہ عالم ہے کہ اب ہوش نہیں
رگِ مینا سلگ اُٹھی کہ رگِ جاں جاناں

مدتوں سے یہی عالم نہ توقع نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

ہم بھی کیا سادہ تھے ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غمِ دوراں سے جُدا ہے غمِ جاناں جاناں

اب کے کچھ ایسی سجی محفلِ یاراں جاناں
سر بہ زانو ہے کوئی سر بہ گریباں جاناں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

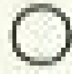
ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اُٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں جاناں

جس کو دیکھو وہی زنجیر بپا لگتا ہے
شہر کا شہر ہُوا داخلِ زنداں جاناں

اب ترا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہُوئے درد کے عنواں جاناں

ہم کہ رُوٹھی ہُوئی رُت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسمِ ہجراں جاناں

ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اُڑتے ہُوئے اوراقِ پریشاں جاناں



اے خدا جو بھی مجھے پندِ شکیبائی دے
اُس کی آنکھوں کو مرے زخم کی گہرائی دے

تیرے لوگوں سے گلہ ہے مرے آئینوں کو
ان کو پتھر نہیں دیتا ہے تو بینائی دے

جس کے ایما پہ کیا ترکِ تعلّق سب سے
اب وہی شخص مجھے طعنۂ تنہائی دے

یہ دہن زخم کی صورت ہے مرے چہرے پر
یا مرے زخم کو بھر یا مجھے گویائی دے

اتنا بے صرفہ نہ جائے مرے گھر کا جلنا
چشمِ گریاں نہ سہی چشمِ تماشائی دے

جن کو پیراہنِ توقیر و شرف بخشا ہے
وہ برہنہ ہیں انھیں خلعتِ رسوائی دے

کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا بسمل ہے فراز
وہ تو قاتل کو بھی الزامِ مسیحائی دے



اب کے رُت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون
زخم پھولوں کی طرح مہکیں گے پر دیکھے گا کون

دیکھنا سب رقصِ بسمل میں مگن ہو جائیں گے
جس طرف سے تیر آئے گا ادھر دیکھے گا کون

زخم جتنے بھی تھے سب منسوب قاتل سے ہوئے
تیرے ہاتھوں کے نشاں اے چارہ گر دیکھے گا کون

وہ ہوس ہو یا وفا ہو بات محرومی کی ہے
لوگ تو پھل پھول دیکھیں گے شجر دیکھے گا کون

میری آوازوں کے سائے میرے بام و در پہ ہیں
میرے لفظوں میں اُتر کر میرا گھر دیکھے گا کون

ہم چراغِ شب ہی جب ٹھہرے تو پھر کیا سوچنا
رات تھی کس کا مقدر اور سحر دیکھے گا کون

آ فصیلِ شہر سے دیکھیں غنیمِ شہر کو
شہر جلتا ہو تو تجھ کو بام پر دیکھے گا کون

ہر کوئی اپنی ہوا میں مست پھرتا ہے فرازؔ
شہرِ ناپرساں میں تیری چشمِ تر دیکھے گا کون

خواب مرتے نہیں

خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے
خواب مرتے نہیں
خواب تو روشنی ہیں نوا ہیں ہوا ہیں
جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں

ظلم کے دوزخوں سے بھی پھُنکتے نہیں
روشنی اور نوا اور ہوا کے عَلَم
مقتلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں
خواب تو حرف ہیں
خواب تو نُور ہیں
خواب سُقراط ہیں
خواب منصُور ہیں

لینن گراڈ
۱۹۷۶

○

یوں تو پہلے بھی ہوئے اُس سے کئی بار جُدا
لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جُدا

گر غمِ سود و زیاں ہے تو ٹھہر جا اے جاں
کہ اسی موڑ پہ یاروں سے ہوئے یار جُدا

دو گھڑی اُس سے رہو دُور تو یوں لگتا ہے
جس طرح سایۂ دیوار سے دیوار جُدا

یہ جُدائی کی گھڑی ہے کہ جھڑی ساون کی
"میں جُدا گریہ کناں، ابر جُدا، یار جُدا"

کج کلاہوں سے کہے کون کہ اے بے خبرو
طوقِ گردن سے نہیں طرۂ دستار جدا

اِس قدر رُوپ ہیں یاروں کے کہ خوف آتا ہے
سرِ میخانہ جدا اور سرِ دربار جدا

کوئے جاناں میں بھی خاصا تھا طرحدار فراز
لیکن اس شخص کی سج دھج تھی سرِ دار جدا

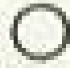
جو رنجشیں تھیں جو دل میں غبار تھا نہ گیا
کہ اب کی بار گلے مل کے بھی گلہ نہ گیا

اب اس کے وعدۂ فردا کو بھی ترستے ہیں
کل اس کی بات پہ کیوں اعتبار آ نہ گیا

اب اس کے ہجر میں روئیں نہ وصل میں خوش ہوں
وہ دوست ہو بھی تو سمجھو کہ دوستانہ گیا

نگاہِ یار کا کیا ہے ہُوئی ہُوئی نہ ہُوئی
یہ دل کا درد ہے پیارے گیا گیا نہ گیا

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فراز تھا ظالم سے چُپ رہا نہ گیا



جو بھی درونِ دل ہے وہ باہر نہ آئے گا
اب آگہی کا زہر زباں پر نہ آئے گا

اب کے بچھڑ کے اس کو ندامت تھی اس قدر
جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا

یوں پھر رہا ہے کانچ کا پیکر لیے ہوئے
غافل کو یہ گماں ہے کہ پتھر نہ آئے گا

پھر بو رہا ہوں آج انھیں ساحلوں پہ پھول
پھر جیسے موج میں یہ سمندر نہ آئے گا

میں جاں بلب ہوں ترکِ تعلق کے زہر سے
وہ مطمئن کہ حرف تو اس پر نہ آئے گا

مت سوچو!

اور اس نے
مرے ساغر میں
مے سرخ انڈیلی —— تو کہا
مت سوچو!

تم یہاں آئے ہو
اس ملک کے
اس شہر کے
اس جلوۂ تسکیں میں جہاں
سب کے سب رقص کناں

[illegible]

مست ادا مت سوچو

جاگتی رات

کے چہرے پہ ہے خوشبو کی ردا

مت سوچو

تم بھی کیا لوگ ہو

پردیس بھی آتے ہو

تو لے آتے ہو

بیمار شب و روز و دل افگار

عزیزانِ وطن کی یادیں

اپنی ژولیدہ و بوسیدہ قمیصوں کی طرح

جن کے دھبوں کو تو خودکار مشینیں بھی نہیں دھو سکتی

یہ جو زنگار ہیں غربت کے

خود آزار جو تاریکیاں ذہنوں کی ہیں

الا سیں بھوں لی ہیں

اس طرح سنبھالے ہوئے پھرتے ہو

کہ جیسے یہ تمھارے دل و جاں ہوں

اس گھڑی تم ہو جہاں

مملکت خواب نہیں

یاں کسی سوچ کا گرداب نہیں

زندگی مے کی طرح

شوخ ہے طرار نہیں

زہراب نہیں

اپنے کشکول کو دہلیز پہ رکھ آؤ

کہ دریوزہ گری

اس جگہ شاملِ آداب نہیں

مت سوچو!

پیرس

۱۹۷۴

سُنا تو ہے کہ نگارِ بہار راہ میں ہے

سفر بخیر کہ دشمن ہزار راہ میں ہے

گزر بھی جا غمِ جان و غمِ جہاں سے کہ یہ

وہ منزلیں ہیں کہ جن کا شمار راہ میں ہے

تمیزِ رہبر و رہزن ابھی نہیں ممکن

ذرا ٹھہر کہ بلا کا غبار راہ میں ہے

گروہِ کجکلہاں کو کوئی خبر تو کرے

ابھی ہجومِ سرِ رہگزار راہ میں ہے

نہ جانے کب کا پہنچ بھی چکا سرِ منزل

وہ شخص جس کا ہمیں انتظار راہ میں ہے

فراز اگرچہ کڑی ہے زمین آتش کی

ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے"

سب لوگ لیے سنگِ ملامت نکل آئے

کس شہر میں ہم اہلِ محبت نکل آئے

اب دل کی تمنا ہے تو اے کاش یہی ہو

آنسو کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے

ہر گھر کا دیا گُل نہ کرو تم کہ نجانے

کس بام سے خورشیدِ قیامت نکل آئے

جو درپئے پندار ہیں اُن قتل گہوں سے

جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے

اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہدِ ستم کی

اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے

یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد

شائد کہ تمہارا قد و قامت نکل آئے

اب کس کا جشن مناتے ہو!

اب کس کا جشن مناتے ہو
اُس دیس کا جو تقسیم ہُوا
اب کس کا گیت سُناتے ہو
اُس تن من کا جو دونیم ہُوا

اُس خواب کا جو ریزہ ریزہ
اِن آنکھوں کی تقدیر ہُوا
اُس نام کا جو ٹکڑے ٹکڑے
گلیوں میں بے توقیر ہُوا

اُس پرچم کا جس کی حرمت
بازاروں میں نیلام ہُوئی
اُس مٹی کا جس کی حرمت
منسوب عدو کے نام ہُوئی

اُس جنگ کا جو تم ہار چکے
اُس رسم کا جو جاری بھی نہیں
اُس زخم کا جو سینے پہ نہ تھا
اُس جان کا جو واری بھی نہیں

اُس خون کا جو بد قسمت تھا
راہوں میں بہایا تن میں رہا
اُس پھول کا جو بے قیمت تھا
آنگن میں کھلایا بن میں رہا

اُس مشرق کا جس کا تم نے
نیزے کی انی مرہم سمجھا
اُس مغرب کا جس کو تم نے
جتنا بھی لوٹا کم سمجھا

اُن معصوموں کا جن کے لہو
سے تم نے فروزاں راتیں کیں
یا اُن مظلوموں کا جن سے
خنجر کی زباں میں باتیں کیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اُس مریم کا جس کی عفّت
لُٹتی ہے بھرے بازاروں میں
اُس عیسےٰ کا جو قاتل ہے
اور شامل ہے غم خواروں میں

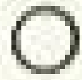
اُن نوحہ گروں کا جن نے ہمیں
خود قتل کیا خود روتے ہیں
ایسے بھی کہیں دم ساز ہُوئے
ایسے جلّاد بھی ہوتے ہیں

اُن بھوُکے ننگے ڈھانچوں کا
جو رقص سرِ بازار کریں
یا اُن ظالم قزّاقوں کا
جو بھیس بدل کر وار کریں

یا اُن جھوٹے اقراروں کا
جو آج تلک ایفا نہ ہُوئے
یا اُن بے بس لاچاروں کا
جو اور بھی دُکھ کا نشانہ ہُوئے

اِس شاہی کا جو دست بدست
آئی ہے تمھارے حصّے میں
کیوں ننگِ وطن کی بات کرو
کیا رکھا ہے اِس قصّے میں

آنکھوں میں چھپائے اشکوں کو
ہونٹوں پہ وفا کے بول لیے
اِس جشن میں مَیں بھی شامل ہوں
نوحوں سے بھرا کشکول لیے



ابرِ بہار اب کے بھی برسا پرے پرے
گلشن اُجاڑ اُجاڑ ہیں جنگل ہرے ہرے

جانے یہ تشنگی ہے ہوس ہے کہ خودکشی
جلتے ہیں شام ہی سے جو ساغر بھرے بھرے

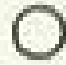
ہے دل کی موت عہدِ وفا کی شکستگی
پھر بھی جو کوئی ترکِ محبّت کرے کرے

اب اپنا دل بھی شہرِ خموشاں سے کم نہیں
سُن ہو گئے ہیں کان صدا پر دھرے دھرے

رہتے ہیں اہلِ شہر کے سائے سے دُور دُور
ہم آہوانِ دشت کی صورت ڈرے ڈرے

گُل بن کے پھُوٹتا ہے لہو نوکِ خار سے
زخمِ رگِ بہار رہیں پتّے ہرے ہرے

زندہ دلانِ شہر کو کیا ہو گیا فرازؔ
آنکھیں بجھی بجھی ہیں تو چہرے مرے مرے



شگفتہ دل ہیں کہ غم بھی عطا بہار کی ہے
گُلِ حباب ہیں سر میں ہَوا بہار کی ہے

ہجومِ جلوۂ گل پر نظر نہ رکھ کہ یہاں
جراحتوں کے چمن پر ردا بہار کی ہے

کوئی تو لالۂ خونیں کفن سے بھی پوچھے
یہ فصل چاکِ جگر کی ہے یا بہار کی ہے

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہَوا بہار کی ہے

شمارِ زخم ابھی سے فراز کیا کرنا
ابھی تو جان مری اِبتدا بہار کی ہے

دل گرفتہ ہی سہی بزم سجا لی جائے
یادِ جاناں سے کوئی شام نہ خالی جائے

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے

مصحفِ رُخ ہے کسی کا کہ بیاضِ حافظ
ایسے چہرے سے کبھی فال نکالی جائے

وہ مروّت سے ملا ہے تو جھکا دوں گردن
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

بے نوا شہر کا سایہ ہے مرے دل پہ فرازؔ
کس طرح سے مری آشفتہ خیالی جائے



کہا تھا کس نے کہ عہدِ وفا کرو اُس سے
جو یوں کیا ہے تو پھر کیوں گلہ کرو اس سے

نصیب پھر کوئی تقریبِ قرب ہو کہ نہ ہو
جو دل میں ہوں وہی باتیں کہا کرو اُس سے

یہ اہلِ بزم تنک حوصلہ سہی پھر بھی
ذرا فسانۂ دل ابتدا کرو اُس سے

یہ کیا کہ تم ہی غمِ ہجر کے فسانے کہو
کبھی تو اس کے بہانے سُنا کرو اُس سے

فرازؔ ترکِ تعلق تو خیر کیا ہو گا!
یہی بہت ہے کہ کم کم ملا کرو اُس سے



تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہو گئے
پھر جو بھی در ملا ہے اُسی در کے ہو گئے

پھر یوں ہُوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا
اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہو گئے

کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے
اب دل سے محو نام بھی اکثر کے ہو گئے

اے یادِ یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے دردِ ہجر ہم بھی تو پتھر کے ہو گئے

سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی ناصحانِ شہر
پھر رفتہ رفتہ خود اُسی کافر کے ہو گئے

اب کے نہ انتظار کریں چارہ گر کا ہم
اب کے گئے تو کوئے ستم گر کے ہو گئے

روتے ہو اک جزیرۂ جاں کو فرازؔ تم
دیکھو تو کتنے شہر سمندر کے ہو گئے



ہر تماشائی فقط ساحل سے منظر دیکھتا
کون دریا کو اُلٹتا کون گوہر دیکھتا

وہ تو دنیا کو مری دیوانگی خوش آگئی
تیرے ہاتھوں میں وگرنہ پہلا پتھر دیکھتا

آنکھ میں آنسو جڑے تھے پر صدا تجھ کو نہ دی
اس توقع پر کہ شاید تو پلٹ کر دیکھتا

میری قسمت کی لکیریں میرے ہاتھوں میں نہ تھیں
تیرے ماتھے پر کوئی میرا مقدّر دیکھتا

زندگی پھیلی ہوئی تھی شامِ ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا

ڈوبنے والا تھا اور ساحل پہ چہروں کا ہجوم
پل کی مہلت تھی میں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا

تو بھی دل کو اِک لہو کی بوند سمجھا ہے فرازؔ
آنکھ اگر ہوتی تو قطرے میں سمندر دیکھتا

سحر کے سُورج

سحر کے سُورج

میں رو رہا ہوں

کہ میرا مشرق لہو لہو ہے

وہ میرا مشرق

جو میرا بازو ہے میرا دل ہے مری نمو ہے

جو میرے اطراف کا نشاں

میری آبرو ہے

لہو لہو ہے

سحر کے سورج
میں نصف تاریک
نصف روشن ہوں
کیا ہُوا ہے
تجھے گہن لگ گیا
کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے
تری شعاؤں کا نُور اندھیروں میں گھٹ گیا ہے
کہ آج ہر رشتۂ رفاقت ہی کٹ گیا ہے

سحر کے سورج
میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں
میں آپ ہی آج اپنی تحقیر ہو گیا ہوں
میں اسمِ تصغیر ہو گیا ہوں
میں اپنا آدھا بدن لیے کس طرف کو جاؤں
کسے دکھاؤں

یہ شیشۂ جاں کی کرچیاں

اپنے خواب ریزے کہاں چھپاؤں

میں اپنی وحدت کہاں سے لاؤں

سحر کے سورج

ستم کی آندھی رُکے

تو میں یہ اُجاڑ آنکھیں جھپک سکوں گا

سسک سکوں گا

لہو کی بارش تھمے

تو میں اس دُکھی بدن کو تھپک سکوں گا

ابھی تو میں جاں کنی کے دُہرے عذاب میں ہوں

جو بجھ چکے وہ چراغ دیکھوں

کہ اپنے ماتھے کا داغ دیکھوں

سحر کے سورج

مری نظر میں تو ان رفیقوں کے قافلے ہیں
جو گھر سے نکلے تھے سر اُٹھائے قدم جمائے
جو منتظر تھے
کہ رزم گاہِ طلب بلائے
جو آزمائش کی ہر گھڑی میں
یقین کی مشعلیں جلائے
وطن کی ناموس کے لیے
بے شمار بازو علم اُٹھائے
رواں ہوئے تھے یہ عہد کر کے
کہ ان کی جانیں رہیں کہ جائیں
مگر وفا پر نہ حرف آئے

سحر کے سورج
مری نظر میں انہی رفیقوں کے قافلے ہیں

کہ جن کا پندار ریزہ ریزہ

کہ جن کے ماتھے عرق عرق ہیں

جو پا بزنجیر

منفعل سر زمیں جھکائے

عدو کے نرغے میں

ان اندھیروں کی سرزمیں کی طرف رواں ہیں

جہاں حقارت کے طعن

نفرت کے سنگ

رسوائیوں کے بازار

منتظر ہیں

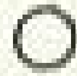
سحر کے سورج

یہ میں نہ دیکھوں

یہ تُو نہ دیکھے

یہ جاں نثاروں شہید یاروں کا چھپا تا لہو نہ دیکھے

یہ میں نہ دیکھوں یہ تُو نہ دیکھے



ستم گری کا ہر انداز محرمانہ لگا
میں کیا کروں مرا دشمن مجھے بُرا نہ لگا

ہر اک کو زعم تھا کس کس کو ناخدا کہتے
بھلا ہُوا کہ سفینہ کنارے جا نہ لگا

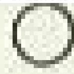
مرے سخن کا قرینہ ڈبو گیا مجھ کو
کہ جس کو حال سُنایا اُسے فسانہ لگا

برونِ در نہ کوئی روشنی نہ سایا تھا
سبھی فساد مجھے اندرونِ خانہ لگا

میں تھک گیا تھا بہت بے بہ پے اُڑانوں سے
جبھی تو دام بھی اس بار آشیانہ لگا

ستم کے عہد میں میں بھی شریک ہوں جیسے
مرا سکوت مجھے سخت مجرمانہ لگا

وہ لاکھ زود فراموش ہو فراز مگر
اسے بھی مجھ کو بھلانے میں اک زمانہ لگا



آزردگانِ شہر کا جیسا بھی حال ہو
اے یارِ خوش دیار تجھے کیوں ملال ہو

اب بات دوستی کی نہیں حوصلے کی ہے
لازم نہیں کہ تو بھی مرا ہم خیال ہو

خود میرا ہاتھ جب مری بربادیوں میں تھا
تیری جبیں پہ کیوں عرقِ انفعال ہو

پھر تُو نے چھیڑ دی ہے گئی ساعتوں کی بات
وہ گفتگو نہ کر کہ تجھے بھی ملال ہو

میری ضرورتوں سے زیادہ کرم نہ کر
ایسا سلوک کر کہ مرے حسبِ حال ہو

ٹوٹا تو ہوں مگر ابھی بکھرا نہیں فراز
میرے بدن پہ جیسے شکستوں کا جال ہو



برسوں کے بعد دیکھا "اک شخص دلربا سا"
اب ذہن میں نہیں ہے پر نام تھا بھلا سا

ابرو کھنچے کھنچے سے آنکھیں جھکی جھکی سی
باتیں رکی رکی سی لہجہ تھکا تھکا سا

الفاظ تھے کہ جگنو آواز کے سفر میں
بن جائے جنگلوں میں جس طرح راستا سا

خوابوں میں خواب اُس کے یادوں میں یاد اُس کی
نیندوں میں گھل گیا ہو جیسے کہ رتجگا سا

پہلے بھی لوگ آئے کتنے ہی زندگی میں
وہ ہر طرح سے لیکن اوروں سے تھا جُدا سا

اگلی محبتوں نے وہ نامرادیاں دیں
تازہ رفاقتوں سے دل تھا ڈرا ڈرا سا

کچھ یہ کہ مدتوں سے ہم بھی نہیں تھے روئے
کچھ زہر میں بُجھا تھا احباب کا دلاسا

پھر یوں ہُوا کہ ساون آنکھوں میں آ بسے تھے
پھر یوں ہُوا کہ جیسے دل بھی تھا آبلہ سا

اب سچ کہیں تو یارو ہم کو خبر نہیں تھی
بن جائے گا قیامت اِک واقعہ ذرا سا

تیور تھے بے رُخی کے انداز دوستی کے
وہ اجنبی تھا لیکن لگتا تھا آشنا سا

ہم دشت تھے کہ دریا ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیاسا

ہم نے بھی اس کو دیکھا کل شام اتفاقاً
اپنا بھی حال ہے اب لوگو فراز کا سا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com